

سیکنڈ تک کڑھی نظروں سے مینوں کو دیکھنے کے بعد اُس نے سر کے ایک جنک سے انہیں پہچھے بیٹھنے کی اجازت دے دی اور سر اندر کر لیا۔ وہ میتوں تیز تیز حلپتے ہوئے ڈرک کے پہچھے تک پہنچے۔ دہان پر انہوں نے اپنے اپنے گھٹھے بیٹھ پرے نہیں پڑھنکے پھر دود دنے کے مل کر ان کو اُپر اٹھایا اور دھڑام دھڑام انہیں ڈرک میں پھینکنے لگے دو گھنون کو ڈرک میں لادنے کے بعد اب صرف اسد کا گٹھا زمین پر رو گیا تھا۔ اُس کو اٹھا کر لادنے کی بجائے غلام اور ریاض نے گردن میں ہاتھ ڈال کر فوجی ساخت کی ہلکی سین گنیں تکالیں اور انہیں سنبھال کر اپنی اپنی طرف سے بھج گئے ہوئے ڈرک کے دنوں دروازہ دن تک پہنچے۔ اسہد چو ریاض کے رُخ پر تھا دم بخود کھڑا دیکھتا رہا۔ ریاض نے ایک جھنک سے دروازہ کھونا اور اُس کی سین گن سے، ہلکے ہلکے شعوں کے ہمراہ گریوں کی ایک بوچھاڑ نکلی۔ اُسی لمجھے دوسرا طرف سے غلام کی گریوں کی بچھاڑ آئی جو ایک دوسیکنڈ دیز تک جاری رہی۔ ڈرک جس کا بخون گئیہ میں تھا ڈرائیور کا پاؤں اٹھنے سے ایک دچک کے ساتھ اچھد، پھر ایک دو ہلکے ہلکے دچک کے کھا کر ڈک گیا۔ اسہد اب ریاض کے پاس ڈرائیور کے اندر دیکھ رہا تھا۔ ڈرک کا درائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا اپنی پیٹ پر اپنے اس تنگ سی جگہ میں امکنہ اٹی لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کی تازہ تازہ ستری کی ہوئی وردی میں پیٹ سے ذرا اُپر دوسری خدا را ہے تھے۔ ایک ذرا بڑا تھا لوری یہ پھوٹا۔ اس کے علاوہ اُس کے کپڑوں پر ارکوئی داشت دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جماںی لینے کی طرز پر منہ کھونا اور کھولے رہا۔ اس کے ہلکے سے ہلکی ہلکی خدا ہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ اس کو اُس کا زخم نظر آیا جو ہوا کی خاطر تیزی سے کانپ رہا تھا۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ باہر کی جانب سُڑما شروع کیا، جیسے خواب کی حالت میں کوہٹ بدل رہا ہے۔ جیسے بھی دُڑھا اُس کی وردی کے ہوئے سو راخ سے ہو کا دھارا اُبیں کر نکلا اور اُس کے پیٹ پر بہت آہواز کے پیچھے گرنے لگا۔ اُس نے اپنا ایک اتھا اُس سو راخ کے اور پر رکھ دیا، جیسے اسے بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اور ماں بھیں گھسیٹ کر بلہر کی جانب نکلنے لگا۔ ریاض میں گن بیدرسی کیسے اُس کے ساتھ کھڑا تھا، اور سپاہی خال خال تنجب نظروں سے ریاض کو دیکھتا ہوا باہر رہا تھا۔ اسہد خوف اور استحباب سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جھپٹنے کی رفتی میں اُس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید اور بے تاثر تھا۔ اُس کی انہیں بھیل ہوئی تھیں، اور دو پیٹ پر اتھر کئے باہر رہی باہر نکلا ا رہا تھا۔ جب اُس کا منہ میں گن کی ناہ سے چند اپنے کے ناصے پر رہ گیا تو ریاض نظری طور پر ایک قدم تیجھے کو سر کا۔ اسہد نے ریاض کو دیکھا۔ ریاض نے تیزی سے یک نظر اس پر دالی۔ ریاض کے چہرے پر گلوکے آزار تھے، جیسے پوچھ رہا تو کہ یہ اُسی آخر چاہتا کیا ہے؟ اسہد کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اُس بے سود شخص کو تھام لے اور اُسے آگے بڑھنے سے باز کئے، پھر ریاض نے نال اٹھا کر بیٹھی دبادی کھٹک جھٹک کھٹک!

اس کو یوں دکھائی دیا جیسے کسی نے اُس سفید چہرے پر کھپڑ کا چھینٹا مار دیا ہے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ پر سو راخ تھے جہاں

گویاں داخل ہوئی تھیں۔ رخسار پر، ناک کی بُڑی پر آنکھوں میں اُس کے چہرے کے ہونٹ پھینگ گئے اور وہ انتہا ہر ٹھیک

آئے۔ بُرچاڑ کے دھنکے سے اُس کا سر پیچے کو جھک گیا اور اُس کا دھڑیست پر جاگا۔ اُس کا سر دسرے فرجی

کی گرد میں جا کر پڑا جو سیست کے اور پر ہوا بیٹھا اور آدھا لیٹا ہوا تھا اور جس کا سر ایک طرف کو دھنک گیا تھا میا خ

اب دہشت سے آنکھیں چاڑے اُس فرجی کو دیکھ رہا تھا جو اُس کی گلیوں سے بُرا تھا۔ وہ ذمی اب آہستہ

کہنیوں کے بل اُٹھ رہا تھا۔ اُس کا خون اُٹھتا ہوا ڈما پھر ڈپھرہ پیچے کر دھنک کا ہُرا تھا، مگر اُس کے کندھے اور لٹختے

آرہے تھے۔ جیسے کسی بجوت نے اُس کے بدن کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ ریاض نے ایک دبار اپنے ہاتھوں

کر کے رُت دی جیسے پھر گولی چلانا چاہتا ہو۔ پھر اُس کے ہنستے ایک گانی نسلی، اور اُس نے ایک ہاتھ کی پُرہی قوت

سے دروازے کو دھکا فرے کر کھڑا کے بند کر دیا۔

”جال نکاؤ۔“ دو چینا۔

اسد کو پایا یک جاگ پڑا۔ اُس نے ایک چلہ بگ لگائی اور ڈرک کے اور پجا کھڑا ہوا۔ ایک لیک دار

میں اُس نے جھوڑوں کے دستے ڈیلے کیے اور انہیں اٹا کر کے جال کھینچ لیے۔ وہ نیچے کو دکر اپنا جال کھینچ رہا تھا

کہ اُسے نلام کی جانب سے ایک بخترسی بُرچاڑ کی آواز سنائی دی۔ پھر کھڑا ک سے دروازہ بند ہونے کی آواز۔ اب

قہ مینوں ڈرک کو دھکا لگا رہے تھے۔ غلام نے ایک گانل دستے کر دوبارہ دروازہ کھولا اور پائے دان پر کھڑے ہو کر

گاڑی کو گئیر سے نکلا۔ پھر اُس نے پُرہی قوت سے شیر ٹک کر ایک پھر دیا اور چلا کر دھکا لگانے کو بولا۔ ریاض اور

اسد نے کندھے ڈرک کی بُڑھی کے ساتھ لگا کر ٹانگوں کے زندہ سے اسے رُحکا نا شروع کیا۔ ڈرک کے کندے پر پہنچ کر

غلام پاہر کو دیڑا اور ڈرک سرک سے اُتر کر گھری ڈھلان پر ڈھک گیا۔ چند لمحوں تک ڈرک حیرت انگیز طور پر سیدھا اپنے

مُڑوں پر چلتا رہا، پھر کمیں دم اٹ گیا۔ اس گجد پر کوئی گھری کندھ تھی، صرف پہاڑ کی اُنجی ڈھلان تھی جو دُر تک

جانی تھی۔ پھر وہوں کے اور پر تلا بازیاں کھاتے ہوئے بھاری ڈرک کے گرنے سے لیکے شور اُٹھ رہا تھا، اور انہوں جیسے

میں کہیں کہیں آگ کی چلکاریاں بدل رہی تھیں۔ انہوں نے ڈرک کے زکنے کا انتظار نہ کیا۔ پسے پسے جھولے اٹھا

کر وہ تینوں بھاگتے ہوئے پر کھر گئے۔ غلام سرک سے ایک طرف اور اسد اور ریاض دوسری جانب، جو حصوں کا

گھر تھا، پہاڑی رہتوں پر اُتر کر رات کے اذیم سے میں غائب ہو گئے۔ ڈرک سنان رہ گئی۔ یہ ساری کارروائی

ایک دُریور منٹ میں انجام پاگئی۔

ریاض کی ماں کو سگریٹ کے دھوپ سے نفرت تھی۔ چنانچہ جب وہ سو گئی تو ریاض اُٹھا۔ اُس نے جیب

سے سگریٹ نکال کر ایک سلکتی ہری گزی سے جلا دیا، اور اُپر والے زینے پر آبیٹھا جہاں اسد لیٹیا سونے کی کوشش

کر رہا تھا۔

”علیٰ“ وہ سرگوشی میں بولا۔

”ہاں۔“

”یہ دو۔“ اُس نے دوسرا سگریٹ نکال کر اسد کی طرف بڑھایا۔ اسد نے سگریٹ پے کر ریاض کے سگریٹ سے جلا دیا اور دونوں انڈھیرے میں بیٹھ کر کش دلگانے لگے۔ وہ سگریٹ پیٹنے کے عادی نہ تھے، مگر کچھی کچھی ریاض کو کہیں سے سگریٹ مل جاتے تو وہ پی دیا کرتے۔ اُس وقت اسد کے دل سے بے وحہ یہک خیال گزرا کہ یہ سگریٹ کہیں انٹک دل کے فوجیوں کے قدر تھے؟ اگر تھے تو ریاض نے کس وقت آڑائے تھے پہ شاید جس وقت وہ جال نکال رہا تھا؟ انڈھیرے میں اُسے دکھائی نہ دیتا تھا ورنہ ہبھاں لیتا۔ سب فوجیوں کو ایک ہی قسم کے سگریٹ ملا کرتے تھے۔

”یکمپ ادھر سے دو سیل ہو گا ہے“ ریاض بولا۔

”ہاں۔“ اسد نے جواب دیا، ”آواز پہنچی ہوگی؟“

”اوہ نہیں۔“ ریاض نے لفی میں سر لٹایا۔ پیچ میں پھاڑتھا۔ پہاڑ آگے آجائے تو آواز ایک فرلانگ نہیں جاتی۔

”یرہات تو ہے۔“

”وہ بیٹھے سگریٹ پہنچتے رہے۔ اسد نے دوین پار سر لٹا کر اُس منظر کو جھلسنے کی کوشش کی جو اُس کی انگھی میں جنم گیا تھا۔

”تم نے بیٹھے پہنچ کیروں نہیں بتایا ہے“ اسد نے پوچھا۔

”تھہارا کیا پہنچتا ہے؟“

”کیروں۔“

”کام خراب کر دیتے۔“

”پھر اب؟“

”نہہ۔“

”کام خراب تو نہیں ہوا۔“

”نہیں۔ مگر پہلے کیا پتا تھا۔“

”اُن۔“ اسد نے ہشتیاق سے کہا، ”پھر اب اگلی بار ہے
”مُہہہہا“ ریاض ہنسا، اگلی بار کسے پتا ہے، ہم نے تآڈر کے بغیر کام کیا ہے؟“
”اب کیا ہرگذاں ہے؟“

”ہرگما کیا، پس کچھے تو پسکھئے پکڑے گئے تو بس ختم۔“

اس نے سگریٹ کا ایک مداکش لگایا۔ اسد بکار کا سگریٹ کی تو میں اُس لڑکے کے چہرے کو دیکھتا رہا جو اپنی زندگی میں، نفع خود سو داگر کی طرح، بلا وجہ خطرے کی ذخیرہ اندوزی کرناجا رہا تھا۔
”تآڈر کے بغیر کیوں ہے؟“ اسد نے پوچھا۔

”ہمیں اجازت نہیں۔ اُھر سے ذہنی آتے ہیں، کمانڈو۔ ہم صرف رہبری کا کام کرتے ہیں، یا تحری کا۔“
”کسی کو بھی اجازت نہیں ہے؟“

”کسی کسی کو ہے، غلام ان کے ساتھ بھی جاتا ہے، رستے کے لیے۔ اُس کی شیئن گن بھی سکری ہے۔“
”اور تمہاری؟“

”غلام نے لا کر دی ہے، میرے ساتھ اُس نے دعہ کیا تھا۔“

”ان میں سے کسی کی اٹھا کر لایا ہے؟“

”اُن۔“

”اب تم نیچے تو پھر؟“

”پھر کیا؟“

”پھر تم بھی ان کے ساتھ جا سکو گے؟“

”شاید۔“ ریاض نے کہا۔

”میں بھی ہے؟“ اسد نے ہشتیاق سے پوچھا۔

”تم تو ان کے اپنے آدمی ہو، تمہیں کیا لگ رہے۔ اپنی مرضی سے جو چاہو کر دو، مشکل توہاری ہے؛ سگریٹ ادھے سے زیادہ جل پکھے تھے، اسد کو علم ہوا کہ خود سری کے اس مقام پر بھی پیشہ دری کے درجے پر، اور وہ اس مقام پر ان لوگوں کے دریان بھیں بدال کر بھی اجنبی ہے۔ یہ سچ کر اُس کا دل مر جا سا گیا۔ انہوں نے اپنے سگریٹ زینے پر مسل کر چکا دیے۔ ریاض اٹھ کھڑا ہوا۔ اسد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہم کرنا ہے، تاکہ اُس کو سونے سے بنجات ہل جائے، مگر اُس کے دل میں کوئی بات نہ آ رہی تھی۔

”تم میں کس ساتھ لے کر سوتے ہو ہے؟ اُس نے سرگوشی میں پڑھا۔

”نہیں۔ چاندی میں رکھ دیتا ہوں۔“

”ماں سوچتا ہے؟“

”ماں۔“

”تمہیں کچھ نہیں کہتی ہے؟“

”نہیں۔“

وہ انکھیں کھولے پھر پچت لیٹا رہا۔ کبھی وہ انکھیں بند کر لیتا، کبھی کھول دیتا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہنے
بات کرے۔ اُس کا سانس بھاری ہو گیا تھا۔ ریاض نیچے والے زینے پر اپنی ماں کے قرب لیٹ کر سوچ کا تھا۔ وہ
انکھیں بند کرتا یا کھرتا، ایک منظر تھا جو چھوڑتا نہیں تھا، بے سر کے اُس دھڑکا منظر جو کہنیوں کے زور پر اٹھتا ہی آ
 رہا تھا، جیسے کوئی بجوت ہو۔

(۹)

وہ پہلوی کا مژد مرے تو سامنے گاؤں نظر آیا۔

”وہ ہے۔“ ریاض سرکے اشارے سے پلا۔

”چار کوس ۰۰ اسد ہے، صحیب نہ ہے۔ اگر پانچ کوس پر ہوتا تو نام پانچ کوس رکھ دیتے ہے۔“

”یہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟“

”ماں نے۔“

”ادھروں۔“ ریاض نے نقی میں سر جلا، ”لگری سے پانچ کوس پر ہے، اور تری سین کوس سے بھی کم۔ لوگوں نے کھافی بیال ہے۔“

اسد حیران رہ گیا: ”یہ کیسے ہے؟“

”بس۔ باقی سئیں کر ایک خیال بنایتے ہیں، پھر اسی کو بتاتے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ تمہیک بھی ہے یا نہیں۔ اور گرد کے گاؤں کا قصہ کچھ اور ہے۔“

”کیا ہے؟“

”ایک دفعہ ایک شخص نہیں سے ادھر آنکھلا تھا۔ وہ چار کوس کی ایک عورت پر عاشق ہو گیا۔ وہ عورت بیاہ تھی۔ بات باہر نکل گئی، اور عورت کے مکر اُس شخص کے ہیچے لگ گئے۔ افرمے گاؤں چھوڑنا پڑا۔ مگر جانے سے پہلے اُس نے قسم کھائی کہ اگر اُس کا عاشق تھا ہے تو وہ اس گاؤں کے گداپ نام لینے والوں کی ایک لکیر کھینچ دے گا۔ وہ گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر جا کر ایک چھوپنپڑی ڈال کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ خدا کے ہم میں عزق ہو گیا۔ بجتنے پہن کر چند جھینے کے بعد جب وہ بکھلاتر شرکہ کر کاٹا پڑھکا تھا، مگر اُس کا چہرو چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ جو بھی اُس کو ایک نظر دیکھ دیتا اُس کا مرید ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس کے مرید دہان اُکر آباد ہونے شروع ہو گئے۔ دو تین برس میں دہان آبادی پڑ گئی۔ پاپنچ برس کے بعد نگے شاہ دہان سے نکل کرڑا ہوا۔“

”نگے شاہ اُس کا نام تھا؟“

”پتا نہیں اُس کا نام کیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں۔ مگر پہلے دن سے اُس نے کپڑے مٹار دیے تھے۔ اُس کے بعد کبھی کسی نے اُسے کپڑے پہننے نہیں دیکھا۔ گرمی ہو یا سردی، ایک لگنگی میں رہتا تھا۔ جب برف پڑتی تو ایک کمبل کی بکل مار لیتا تھا۔ اس سے اُس کا نام ناگے شاہ پڑ گیا۔ خیر، اُس کے بڑے بڑے مرید اُس کے ساتھ کوچ کے انگل جگہ پر پہنچ گئے، مگر زیادہ تر دہیں بیٹھے رہے۔ بستی دہانہ آسان ہے، چھوڑ کر جاما آسان نہیں۔ نیچے جگہ پر نشے روگ اُس کی شہرت من کر کے، اپنی اپنی غرضیں لے کر آئے اور کچھ دہیں رہ گئے۔ غریب روگ روٹی کے ہم پر آئیں یا نہ آئیں، خدا کے نام پر خورد آتے ہیں۔ اور خدا کا نام پر پیغمبر کا نام ہی ہوتا ہے۔ خیر، یہاں جی چڑھتے جتنے گاؤں پڑ گیا۔ پاپنچ سال کی مت پوری کر کے ناگے شاہ دہان سے بھی چل ڈا۔ اسی طرح جگہ جگہ گاؤں آباد کرنا ہوا وہ چار کوس کے گرد اگر وچتا رہا۔ اگر چالیس سال کے عرصے میں اُس نے چھترختم گر کے اپنی بات پوری کر دی۔“

”چھتر کہاں گیا؟“

”وہ سامنے۔“ ریاض نے اتحاد سے اشارہ کر کے بتایا، ”جہاں بزر جہنم اگاہ ہے۔“

”واپس چار کوس؟“

”ہاں۔ یہ اُس کا مزار ہے۔ چالیس سال میں چار کوس کے بہت سے روگ اُس کے مریدن گئے تھے جب اُس کا حصار ختم ہوا، ان گاؤں کو ناگے شاہ کا حصار کہتے ہیں، اور بھی ادھر اہم رے بہت سے گاؤں حصاری گاؤں کہلاتے ہیں، جب حصار ختم ہوا تو چار کوس والے زوروے کے اپنے گاؤں لے گئے۔ کہتے ہیں سو سال سے اور پر اُس کی عمر ہوئی تھی۔ یہ اُس کا مزار ہے۔“

”اس سحرت کا کیا نہ ہے“

”کس سحرت کا ہے؟“

”جس پر دعا شق تھا۔“

”پتا نہیں، ریاض لا پروائی سے بولا، تمرا گئی ہوگی۔“
”بھیب بات ہے،“ اسد حیرت سے بولا۔ ”اس کی خاطر یہی علاقوں آباد ہوا، اور اس کا نام محیٰ کرنی
نہیں جانتا۔“

”یہ تو غشت کے کام ہیں،“ ریاض نے کہا۔ ”بہادر جو بھی بن جائے۔“

”یہ بھی ایک کہانی ہی ہے،“ پچھلے دیر بعد اسد بولا۔ ”تمہارے پاس لیا شہرت ہے کہ یہ کہاںی تھی ہے۔“
”شہرت ہے چلتے ریاض نے اس کی طرف یہیں دیکھا جیسے اس کی کم حتعلیٰ پر حیران ہو رہا ہو۔“ سارے
اروگرد کے گاؤں بھر میں بنے ہیں شہرت کی کیا ضرورت ہے؟“

”پتھیں کیسے پتا ہے؟“

”سب کہتا ہے۔ بھیں کہتا ہوں ہیں، پڑا ری کے کانہ دس میں سب جگد کھا ہے۔ چار کوں سب سے
پڑا ہے۔ اس وقت بھی یہ چار کوں تھا جب بیہاں اور گوئی گاؤں نہیں تھا۔“

اس کھیانا سا ہو کر چپ ہو رہا۔ اسے حیرت ہر بھی تھی کیسے ان لوگوں نے اپنے زور دار مفرودخوں
میں الجھا کر اس کی عقل کو کچھ دیر کے لیے معطل کر دیا تھا۔ اگر اس سے نہ رہا گیا؛

”اگر لوگوں کو اس بات کا علم ہے،“ اس نے پوچھا، ”تو پھر کیسے سب اس فرضی کہانی پر تفہین کر
لیتے ہیں؟“

”آسانی کے لیے،“ ریاض نے جواب دیا، ”اس کے نام سے ہی کہانی نہیں ہے۔ آسانی سے بھر میں
آہات ہے۔ لوگوں کو فرضی باتوں پر تفہین کرنے کا کوئی شرط نہیں ہوتا۔“

سرجن صرپہ نخا اور گلپیوں میں وہ رپ سیدھی پڑ رہی تھی جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے۔ ریاض نے
دو ایک جگہ رک کر سحرت کا پتا درپاافت کیا اور وہ اس کے گھر ہنسنے پڑے۔ گھر ہس کے علاقے کے پیشتر گھر دل کی طرف
بیک کرے پر مشتمل تھا، سحرت گھر کے ہرگے مختصر سی پی ہمل زین پر، جو حن کا کام دیتی تھی، چھاڑ دے رہی تھی۔
اس نے گھر سیدھی کر کے رکوں کی بات مُنی اور سادگی سے انہیں گھر کے اندر بیٹھنے کو کہا، در دانے میں وس گیا، وہ برس
کا ایک رنگا بیٹھا تھا۔ ریاض اور اس کے پاس سے گزر کر اندر داخل ہوئے اور ایک طرف زین پر بیٹھ گئے کہے

یہی صرف چند چیزوں تھیں اور وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھیں۔ اس کے میں صفائی کا حکس ہوتا تھا۔ اس کی دیواریں بھی، جو چھٹے چھوٹے ٹیڑھے پتھروں کو بھارت سے چن کر کھڑی کی گئی تھیں، نسبتاً سیدھی اور صاف تھیں۔ بعد از اندر آ کر ان کے پاس زین پر بیٹھی تو اسد کو اس کی چال میں، اس کے میٹھنے کے انداز میں ایک ترتیب کا حکس ہوا۔ وہ ایسی عورتوں میں سے تھی جن کے چہرے سے ان کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہی علوم ہوتا تھا جیسے کم سے کم اجزائے کے استعمال سے اس عورت کی شبیہہ تیار ہوتی تھی، اور اسی وجہ سے پائیدار تھی۔ اس شبیہہ میں کافی شے فائزہ تھی۔ اس کی موجودگی میں اسد اور ریاضی دلوں پر خاموشی چاگئی۔

”خوشی کیوں نہیں آیا؟“ عورت نے پوچھا۔

”خوشی کہم پہے۔“ اسد نے جواب دیا، ”کچھ دن کے بعد آئے گا۔“

وہ چند لمحوں تک نیشنے کی سی شفاف نظر وہیں سے اسد کو دیکھتی رہی۔ اگر اسد کی نظر قرٹ گئی اور وہ انہیں جھکا کر انگلیوں سے گزتے کی جیب ٹوٹنے لگا۔

خود ری دیر میں اس نے جیب سے کافی کا ایک پر زہ برآمد کیا۔

”دکھاؤ۔“ عورت اس کی جانب سر جھکا کر بولی۔

اسد نے پر زہ اس کے اعتماد میں کپڑا دیا۔ وہ کافی لمحے تک کافی پر بننے ہوئی اس پتھے کی شکل کو دیکھتی رہی، جیسے ذہن کو کھو ج رہی ہو۔

”ہاں۔“ پتھروں سراٹھا کر بولی۔

”کس کا نام کیا ہے؟“ اسد نے پوچھا۔

”نام معلوم نہیں۔ مگر میں جانتی ہوں۔“

”کہاں ملتی ہے؟“

”بہیں۔“ وہ سر کے بلکے سے اشارے سے بولی، ”رجاہ کے پیلے میں۔“

”اس موسم میں ہوتی ہے؟“

”ہاں۔“

اسد نے ریاضی کی طرف دیکھا۔

”اس کا جتنا مشکل کام ہے؟“ عورت بولی، ”تمہارے بس کا نہیں۔ بلکی بُوٹی ہے۔ میں لے آؤں گی۔“

”کس دش میں کام آئی ہے؟“

”سانس کے مرض میں؟“ اسد نے کہا۔

”کس کو ہے؟“

”علی کو ہے۔“ ریاض نے جواب دیا۔

”تھوڑا۔“ وہ افسوس سے سر ٹلا کر بولی، ”لما مرض ہے۔ جان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ مگر بُری میں بُری طاقت ہوتی ہے۔ ایشہ شخاودے گا، بلکن بُری ہے، وہ دچار چار پتے چینی ڈپنی ہے۔ ایک دو دن میں چینی مل لے آؤں گی تیرے دن اگر لے جانا۔ پتے انار دُر؟“

”ساتھ ہی رہنے والے ہیں۔“ اسد نے کہا۔

”خوشی کہتا ہے کسی کسی بُری کے پروں کی خاصیت اور ہوتی ہے، دندھی کی خاصیت اور ہوتی ہے۔ اپنا اپنا

علم ہے۔“

”میں پئیے دے دوں گا۔“ اسد نے کہا، ”میرے پاس پہنچے ہیں۔“

”پیروں کی مجھے خردت نہیں۔ میں محنت کرنے والے ہو،“ خودت بولی، ”یہ بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا ہے؟ میں ہمیشے ہرگئے ہیں۔ کس کام پر گیا ہے؟“

”ضروری کام پر گیا ہے۔“ اسد نے کہا۔ خودت کی نظریں اس پر گلی رہیں۔ اسد کو کوئی اور بات نہ ملی تو بولا:

”میں نے شاخ کرنی اور آدمی ہے جو یہاں بُریوں کا کام کرتا ہے اور خوشی اُس سے لے جایا کرتا ہے۔“

”تم خوشی سے مل کر نہیں آئے؟“

اسد کو اپنی غلطی کا احسوس ہوا۔ ”وہ کام پر گیا ہے۔“ اُس نے دھرا کر کہا۔

”نہیں۔“ وہ بولی، ”اس علاقے میں کسی اور کو اس چیز کا نام نہیں۔ خوشی سارا سارا دن ان کے پیچھے جھکنے میں پھرتا بتا ہے۔ جیسے کوئی سرداڑی ہو۔ پھر لا کر ان لوگوں میں باشٹ دیتا ہے۔ پھر پانچھر کو اُصر لے جاتا ہے۔ کہتا ہے اُصر کوئی بُری جسم ہے۔ اُس سے تھوڑا بہت علم اسے ملا ہے۔ کوئی کچھ دے کرے یہتا ہے، نہیں ترکھتا ہے۔ یہ اسکے کی چیز ہے، وہی اس میں شفادالتی ہے، اُبھی نکال لیتا ہے۔ اُصر سے جب آتا ہے تو کچھ پیسے لتا ہے۔ اُصر اس کا کچھ کاروبار ہے۔ مگر پہلے اتنی درستک اُصر نہیں رہا۔ میں ہمیشے ہو گئے ہیں۔ آج سورج میں بُری تپش ہے۔ تمہیں پیاس گلی ہو گی۔ میں تمہارے لیے سی لے کر آتی ہوں۔“

وہ انھی اور دیوار کے پاس رکھی ہوئی کھلنے مژکی می کی ایک مشکل انٹھا کر باہر سکل گئی۔ اسد نے اسے بے کاوش پھٹے پھترتے، متلتے اور باہر جاتے ہوئے دیکھا، جیسے برا جلطی ہو، اور اُس کے دل میں بے معلوم سا افسوس پیدا ہوا۔

پتھر و پیزیر پہنچا رہی جاتا اور بھری نظر دن سے آن درون کو بھتارا ہے چند منٹ کے بعد عورت درون اتھر میں ملکی تھا سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ملکی نین پر رکھ کر جمل بھر بی برقی سرن مرچیں اُس میں پھر لگائیں۔ اس کے بعد مشی کے ایک بڑتی سے نمک کی چھوٹی سی دل نکال کر ملکی میں گرائی۔ پھر اس نے امزیم کا ایک گلاس پانی سے وھیا اور ایک اتھر سے ملکی اٹھا کر اسی عھوس میں آمدیل نہک لے دل استی کے ساتھ کھاک سے گلاس میں گر پڑی۔ پھر گلاس کو ارپنا لے جا کر ایک دھار سے استی داہیں ملکی میں گرائی۔ نمک کی دل کھاک سے ملکی میں گری، جس سے استی کا ایک بڑا سا چینڈا ملکی کے نہ سے اُنکر کر باہر نہیں پڑا گرا۔ دو تین بار اسی طرح استی کو پھینٹنے کے بعد اس نے ملکی اور گلاس ان درون کے سامنے نہیں پر لارکھتے اور اتنی جگہ پر میٹھی۔

”تم خپاڑکوں کی رہنے والی ہوئی ریاضی نے استی گلاس میں آمدیلیتے ہوئے اُس سے پڑھا۔

”مہیں۔ میں جھنڈا بس کی بُرس میں دیسرائی صرات کے گھر کام کرتی تھی۔ عورت نے دیپتا یوں کے آسان انداز میں اپنی کہانی بیان کر شروع کر دی۔ ”وہیں پہلی بُری بُری۔ دہان سے میں سعیل دکاندار کے ساتھ نکل کر رجاء ہجی آئی۔ اُس نے مجھے مسلمان کر کے میرے ساتھ نکاح کر لیا۔ دو سال میں اُس کے ساتھ رہی۔ دو سال کے بعد وہ مجھے پھر مود کر واپس جلا گیا۔ ”عبد اللہ“ اس نے دروازے میں بیٹھے ہوئے رنگ کے لفڑی کھا، میرا بیٹا ہے۔ میں نے پھر ہوں میں مفت شروع کر دی۔ دیہیں پر خوشی رجاء کے بیٹے میں آیا کرتا تھا۔ وہ مجھے اور عبد اللہ کو بیہاں لے آیا۔ مجھے اُس نے برمی آرد سے رکھا ہے۔ یہ گھر“ اس نے کہے کی پیواروں پر نظر ڈال، ”اُس نے اپنے اخھوں سے میرے بیٹے بیایا ہے۔ مگر اُس کے سرہیں کافی سودا ہے۔ کہیں نمک کرنہیں بیٹھتا۔ ادھر سے اُدھر پھر رہتا ہے، ما تھر میں جو کچھ ہوتا ہے دے دیتا ہے۔ اُس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے۔“

عورت کے سفید چہرے پر پہلی بار نگاہ کی ایک جگہ آئی، پھر دُسری، پھر ساری مجھے تیزی سے خیال بدل رہے ہوں۔

”کیا چیز ہے؟“ اس نے تجھے پوچھا۔

وہ آنکھیں پھیلانے ایک تار اسے دھکتی رہی۔ جیسے کوئی خیال دھونڈ رہی ہو۔ پھر سادگی سے بول： ”اس کے دل میں لاپک نہیں۔“

اس نے دروازے کے باہر نظر ڈالی۔ باہر دھوپ میں چکتی ہوئی مکانوں کی نگلی ویاروں کا اسرار پھیلا تھا۔ ریاضی نے دو گلاس استی کے چڑھا کر خال گلاس اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے گلاس بھر کر استی کا پیسا۔ پھر وہ اُنکھے ہے۔ اس ناگوش تھا۔ وہ پہاڑی راتوں پر آگے چیچھے چلے آ رہے تھے جہاں دھوپ تیز اور یہ سرد پھر دن پر

چمک رہی تھی۔ انسانی زندگی کے سارے میں تہہ ور تہہ اضلاع ہر کا چلا جا رہا تھا۔ اس آدمی کی حقیقت کیا تھی؟ خوشی تھی۔ ایک بنت۔ دبل ایکنٹ۔ ملزم۔ اور اب ہے درویش!

اور میرا نہیں؟ کیا یہ میری قسمت میں لکھا ہے، اس نے سوچا، کہ جس شخص سے مجھے نامہ ملے وہ ہمیشہ میرے سامنے ایک صورت بنا رہے ہے پہلے حکیم، اور اب خوشی۔ پہلیسا راز ہے..... اسکے دل میں شے کا آڑک اور جسم ہو یو، جس کو اس نے بیک ثابت عمل کا قدم اٹھا کر اپنے تین سلانے کی کوشش کی تھی اور یہ سمجھ رکھا تھا کہ اب راستے سے ہٹ پڑ کا ہے، وہیں ہرجو دن تھا اور دوبارہ کردٹ لے رہا تھا۔ آدمی کے اسرار کی کرن سی ایسی صورت پہنچا ہو جس پر وہ دڑک لیعن کر سکے ہے وہ ہاتھ چیچھے باندھے، سر بھکائیے، مانچے پنکڑ کا بوجھ بیٹے چلا جا رہا تھا اور ایسی کوئی ایک صورت ناپیدہ تھی۔ ہر ایک تہہ کا ایک رُخ تھا، اور خوشی تھی کہ اس رُخ نے اس کے فہم کو پچھاڑ دیا تھا۔ اس نے گجر کر ہیں خیال کو جھٹک دیا۔

ریاض باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ عورت کی ہرجو گلی میں خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اب گریا اسے زبان لگ گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ باتیں کرتے کرتے ریاض اس عورت کا ذکر بار بار کرتا، اور جب وہ اس کا ذکر کرتا تو اس کی باتیں میں ایک چمک پیدا ہوتی۔ عورت کا نہم جنت تھا اور وہ عمر میں ریاض سے ہندڑہ سال بڑی ہو گی، مگر اس نے اس زعفران کے کو مسح کر دیا تھا۔ ریاض کو اس حالت میں دیکھ کر اسکو ایک انجانی سی سستت ہوئی۔

”پرسوں آئیں گے؟“ اس نے کہا۔

”مکمل تباہیں گا؟“ ریاض نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”رات کو چھاپ کے گھر پہنچ لے گا۔“

”کس بات کا؟“

”اُدھر سے سپاہی اُرہے ہیں؟“

”اتئی جلدی ہے۔“

”ہاں۔“ ریاض نے کہا، ”ویکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

جب سے انہوں نے ٹرک مارا تھا اس وون سے ان کی نقل و حرکت پہنچنے پا بندی گھر چکی تھی۔ فرج اور پولیس لے دیئے پہنانے پر چھاپے مارے تھے اور پیسوں لوگوں کو پکڑ کرے گئی تھی۔ مگر فرار نہ شد گان میں کئی ان کے آدمی بھی تھے۔ اب یہ لوگ اس دھڑکے میں دم سادھے بیٹھے تھے کہ ایذا کے زیر کس کس کی ہمت جواب دے

جاتی ہے اور کون کون بک اٹھتا ہے، اور بکتا ہے تو کیا بکتا ہے سلطان شاہ کے حلقوں میں رائے دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک دھڑے کی رائے تھی کہ سرکار اس وقت بُرا ہش کے عالم میں ہے، فوج کی دستی اندازی میں اضافہ ہو، حکومتوں پر دباؤ پرے کے بیے پنی کارروائی تیر کرو نی چاہیے تاکہ بد منی بُرھے، فوج کی دستی اندازی میں اضافہ ہو، حکومتوں پر دباؤ پرے اور جنگ کی کرنی صورت نکلے۔ دُبڑا جڑا، جس میں پرانے پرانگی گل قسم کے لوگ شامل تھے، کہتا تھا ابھی وقت نہیں، وہ کسے رہو اور یہ مرد کا ٹر، مناسب وقت کا انتظار کرو۔ ان دونوں بھر کیفیت ہم کارروائیوں میں ایک عاضی تعطیل پیدا ہو چکا تھا۔ ریاض، غلام اور اسد کو سخت سرزنش کے بعد سلطان شاہ نے گھروں میں تقریباً متعینہ کر دیا تھا۔ ان کا ابھی تک فوج یا پولیس کی گرفت سے بچنے کے لئے پہنچنے کے لئے پرانا ایک معجزے سے کم نہیں تھا، گودہ دن دن، رات بھر گھر میں بیٹھے چھوٹے سے چھوٹے لمحے پر چونک اٹھا کرنے تھے۔ چند روز کے بعد تگ اُکر ریاض نے باہر نکلا شروع کر دیا۔ اُس کی ماں نے دو ایک بار اُسے منع کیا، پھر خارش بور ہی۔ ریاض سلطان شاہ کے پاس بھی ہو آیا تھا، اور گو سلطان شاہ نے اُسے دُور کیمیں جانے سے سختی کے ساتھ منع کر لکھا تھا، مگر آج خود سرمی میں وہ اسد کوے کر جاؤ کوں کوں نکل آیا تھا۔ اور اب اُس نے یہ خبر دی تھی۔

”اُتنی جلدی کیوں آرہے ہیں؟“ اسد نے پھر پوچھا۔

”پچھو لوگوں نے پیروں کے بیے تگ کرنا شروع کر دیا تھا، ہمارے اپنے لوگ تھیک ہیں، مہینہ دو جنینے بھی نکل جائیں تو پچھپ رہتے ہیں۔ بیلے کی طرف کے لوگ لا بھی ہیں، پھیے کے بیے ان کا گزڑ اور نہدوں کے لیے ما تھو گھلارہتا ہے۔ ان کا پریت نہیں بخترتا، پیے کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔“

”ہو سکتا ہے اُھر سے بھی پیسہ لیتے ہوں۔“

”اُھر سے اُن کو مٹا نہیں ورنہ پیسے سے انکار نہ کریں۔“

”سلی جھی ان کو دیتے ہو؟“

”پہلے دیتے تھے، اب نہیں۔ بیچنے لوگ کئے تھے، کچھ بند دیں فوج کے ما تھوں پلی گئی تھیں۔ اب پیروں سے ان کا مزہ بھرتے ہیں۔ مگر مانگنے سے باز نہیں آتے۔“

”ہو سکتا ہے، اسدنے بات کی،“ صرف پیے دینے آرہے ہوں۔

”ہاں۔“ ریاض نے جواب دیا، ”مگر ازاہ ہے کچھ نہ کچھ ہو گا۔“

”تمہیں کہاں سے پتا چلا ہے؟“

”پچھا سے۔ ایک نیا ادمی کی اُھر آیا ہے۔ شہر چلے گے؟“

"ابھی؟"
"رات تو؟"

اس نے غیر قصینی نظروں سے ریاض کو دیکھا۔

"چھپا کچھ نہیں کہے گا۔" ریاض شرارت سے بولا، "میں تم بار ہو آیا ہوں۔"

"تم آج بھی بغیر اجازت کے مجھے داخلے آئے ہو۔"

"خیک ہے۔" ریاض صدمی لہجے میں بولا، "تمہارا کام ضروری تھا۔ کبھی نہ بھی تو کرنا ہی تھا۔"

"تم ایسی مدد زدہ کیوں کرنے ہوئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"تم تو ارادم طلب ہو۔ باہیں کرنے میں شایر ہو، باں باں کرنے رہتے ہو مگر تمہارے ہد نہیں ملتے۔

"میں اندر پہنچا پہنچا تک آ جاتا ہوں۔"

"ہماری حفاظت کے لیے ہی سلطان کہتا ہے۔"

"چھاتوبے عقل ہے۔ تم اُس سے بھی نہ رکھے گے ہو تو یہیں پتا ہے کہ جتنے لوگ چھاپے میں پڑے گئے ہیں سب گھروں میں پیٹھے ہوئے تھے ہیساں نے ہوئے تھے۔ چھپا کے کہنے پر یہیں دورن گھر پہنچا رہا۔ میرے ہاتھ میں ہرماڑ گھرا آتا ہی نہ۔ تم روگوں کی عقل میں اتنی سی بات نہیں آتی۔ آگے کیا کر دے گے؟"

اسد حیرت سے آئے دیکھتا رہا۔ اچانک اُس کو ایک خیال آیا، جو کئی بار اُس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

"ریاض، پچھو دیر کے پند وہ بولا۔" تم یہ کلام کیوں کرنے ہوئے ہیں؟"

"کون سا کلام؟"

"یہ خون خرابے کا کام۔"

"سب کرنے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے پیروں کی تمیں حص نہیں، اور کسی ہیز کا لاپسچ نہیں۔ پھر کیوں اپنے آپ کو خطرے میں

ڈالنے رہتے ہو؟"

"کیوں کا تو کوئی جواب نہیں؟"

"پھر بھی، کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔"

"وجہ کیا ہوگی؟" ریاض لاپرواٹ سے بولا، "بم غریب لوگ ہیں۔ دولت والے لوگ اپنے لیے قانون بناتے

ہیں۔ ہم انہیں توڑتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے قانون بناتے ہیں گے، غریب لوگ انہیں توڑتے رہیں گے۔"

وہ دھوپ میں آگے پیچے چلتے رہے۔

”تھمارا مجھے پتا نہیں، میں پرتوں آؤں گا۔“ پکھ دیر کے بعد اسد بولا۔

”لیکن آؤ گے ہے۔“

”ماں، تھارا کیا خیال ہے، جنت تھارے بغیر مجھے بولی نہیں دے سے گی ہے۔“

”ریاض بنس پڑا۔“ تم لیکنے نہیں آ سکتے۔“

”کیوں ہے؟“

”رسٹہ بھول جاؤ گے۔“

”پُرچھ پُرچھ کر آ جاؤں گا۔ جنت کا پتا تو سب ساتھ اسان ہے۔“

دفعہ پڑتے پڑتے اس کو اس سے ہوا کہ دس قدم پر جو موڑ آ رہا ہے، وہ مر نے کے بعد چار کوں نظریں سے او جمل ہو جائے گا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے مگر نظر دالی۔ بگارن آدمی سے زیادہ ایک پہاڑی کی اڑت میں جا پڑ کا تھا۔ مگر چند لمحے تلاش کرنے کے بعد اس کی نظریں کو جنت کا گھر مل گیا۔ وہ عمومی سانچی پھٹت والا گھروندہ اس فاسٹے سے بھی ان آئٹے پیدھے گھر دن کے جو جم میں الگ خلگ دکھائی دے رہا تھا اگر نہیں کی دیواریں ساختہ دلے گھر دن سے ملتی تھیں۔ اس کے طول و عرض میں اور اس کی بنادوں میں ایک صاف سترھی ترتیب دکھائی دیتی تھی جو دیواروں کے اس بگھٹت میں ایک محور کے ماتنہ تھی، جس نے کو معلوم ہوتا تھا اس بھی زرکیب بھی بُرٹی ایادی میں اپنی مرجو دگی سے ایک ترازوں پیدا کر رکھا تھا۔ اس گھر کو، اس نے سرچا، کیوں میں بیباں رک کر دیکھ رہا ہوں پہس گھر سے میرا کیا تعلق ہے ہے وہ پہنچا اور تیر تیر پڑتا ہوا راستے کا موڑ تڑپ کیا۔ چار کوں اس کی نظریں سے او جمل ہو جپا کا تھا۔ درجنی بھی کوشش کرنا کو خوش محمد کا خیال اس کے دل میں نہ تھے، اتنا ہی روشنیاں اس کے دل میں پیٹھا جا رہا تھا۔ افرینگ، اُر اس نے اس خیال کو دل سے بخالنے کی کوشش ترک کر دی جی اور پہلے باعث نہیں مخدود کی شکل کو باد کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے بیباں تک رمحی طرز یاد رکھا کہ وہ اس ایادی سے واقع ہے، اسے دیکھ بھی جپکا ہے، مگر کوشش کے باوجود اسے اس کا چہرہ یاد نہیں آ رہا تھا، جیسے کہ اس خیال ہر جو دل پہنچ رہا ہو گر ذہن میں نہ آتا ہو۔ اس کے منہ پر ڈار جھی تھی، یار، ڈار جھی نہہ اتحا ہے اس کا چہرہ لمبا تھا یا پڑھا تھا۔ سر پہاں تھے یا وہ سر سے گنجائی، یا کہ اس کے بال نہیں میں چھے تھے؟ اس نے کوئی مختلف شکلوں کو ان محروم کھلائے واقع کی کوشش کی، مگر اس کے ذہن میں اگر آتا تھا تو ایک ہی نقش آتا تھا اور وہ نقشہ یہ تھا، حوالات کے دروازے کی سلاخیں میں اور ان کے پیچے نیم انہیں ہے میں ایک دھنڈ لاسا چہرہ ہے جس کے نقش صاف نظر نہیں آ رہے۔ اس نے ذہن

کی آنکھوں کو بار بار پھیلایا کر اور سکیر کر دیکھا، مگر یہ نفقة نہ پدلا۔ صرف کبھی کبھی، حیرت انگیز طور پر، وہ چہروں اندھیرے میں سے اُبھرتا اور مجھے بھر کے لیے اُس کے نقش صاف ہو جاتے، اور وہ چہروں اسکا اپنا چہرو ہوتا۔ بھر فوراً دی وہ نقش پھیل کر دھنڈ لاجاتے اور خوشی تھر کے عین پر معین چہرے میں زندگی ہو جاتے۔ اس نے کئی بار نظری اٹھا کر ریاض کی جانب دیکھا، جیسے مدد کیلئے پکار رہا ہو۔ مگر ریاض اب خامش تھا اور اُس کے آگے چلا جاتا تھا۔

بانی کا دن گھر پر گزار کے وہ دونوں شام کے وقت بارٹے کے لیے روانہ ہوئے۔ جس وقت وہ اباوی میں داخل ہوئے رات پر گئی تھی۔ سلطان شاہ کے گھر کا دروازہ اس کی بڑی نے کھولا۔ ایک منٹ تک اس نے ریاض سے بات کی اور دروازہ بند کر لیا۔ ریاض اسکے لئے کہاں پہنچا۔

”سلطان گھر یہ نہیں ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”وین کے گھر ہے۔“

”کہاں؟“

”اوھر۔“

وہ اندھیری گھیوں میں دیر تک چلتے رہے حتیٰ کہ قبصے سے باہر نکل آئے۔ پھر وہ ایک مختصر سا پچھر لگا کر ایک مقام پر دوبارہ قبصے میں داخل ہوئے۔ اس دین سے پہلے مل چکا تھا مگر اس کے گھر کبھی نہیں لیا تھا۔ اس ناہر ایک گلی کے وسط میں، بڑے گھر دن کے درہ بیان پھنسا ہوا تگ سادیں کا گھر تھا۔ اس کا دروازہ عام دروازوں کی نسبت بچھوٹا تھا، جیسے دراڑ سے سائز کی کھڑکی ہو۔ اسکے بعد اور ریاض ابھی چند تقدم فوری ہی تھے کہ دروازہ کھلا، ایک سر اندر سے لئے دو لمبے کونو دار ہولہ پھر غائب بر گیا۔ اس کے بعد میں آدمی یہی کے بعد ویگرے دروازے سے جھک جھک کر باہر نکلے۔ بک پیکنڈ کو تینوں نے رُک کر سامنے نظر والی اور دُسری طرف کرچل پڑے۔ دروازہ کھلدارا۔ اندھو شخص گھر ٹھنڈا تھا اس نے باض کو پہچان لیا تھا اور دہان رُکا ان دونوں کے داخل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

اسکے بعد اس کی نظریں ان میں آدمیوں میں سے ایک پر گئی ہوئی تھیں۔ یہ کون ہے ہے جس نے اس کے زور دیتے ہوئے سوچا، میں اسے جانتا ہوں۔ اندھیرے کی درجے کے وہ اس کی شکل نہ دیکھہ پایا تھا، مگر اس کی شپیرہ دیکھی بجا تھی اور اس کی چال بے حد ما فوس تھی۔ میں اس سے رجھی طرح واقعہ ہوں۔ یہ کون ہے جو اس کی اُدمی تیزی سے اندھیرے میں غائب ہونے جا رہے تھے۔ اس آنکھیں پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ن کے پیچھے چل پڑا اور دروانہ سے سے آگے نکل گیا۔

”علی!“ ریاض نے نبھی آواز میں اسے پکارا۔

جیسے بھی ریاض کی آواز اُس کے کان میں پڑی اُسی لمحے گیا اُسی نے اسد کے ذہن کا کوئی ٹین دبا دیا ہو۔ اُس نے زریب بیک یہرست زدگان دی اور اُس کے جسم پر روئیں کھڑے ہو نہ گئے۔ میرحسن! یہ میرحسن ہے۔ بیہاں کیا گر رہا ہے؟ اسد کی سمجھیں مذاہرا تھا کہ کیا کرے، میرحسن کے چیخپے بھاگے یا وہیں کھڑا رہے۔ ریاض کی آواز دوبارہ اُس کے کان میں پڑی۔ ریاض اب دروازے کے اندر کھڑا اشارے سے اُسے بلارہا تھا۔ اسد بھاگ کر دردائے پر پہنچا اور ریاض کو ایک بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بولا:

”وہ کون ہے؟“

”کون؟“ ریاض نے چک کر ایک قدم باہر کھا اور انہیں ملکھیں پھیلا کر دیکھنے کی رشش کی۔

”وہ جزویج ہیں جا رہا ہے۔“

”میں ہے۔“ وہ بولا۔

”میں اسے جانتا ہوں۔“

”پھر تو ہو سے کیوں پوچھتے ہو؟“

”یہ بیہاں کیا کر رہا ہے؟“

”تمہیں پتا ہو گا۔“

اسد اُس کا بازو چھوڑ کر میرحسن کے چیخپے مجگئے لگا تو ریاض نے اُس کا باہم پکڑ دیا۔

”یہ سلیے کے نومی ہیں۔ پیسے دیسے دیسے آئے ہوں گے۔ میں اسے جانتا نہیں، مگر پہلے میں نے دیکھا ہے۔

”تم کہاں بھاگ رہے ہو؟“

”نہیں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا بات؟“

”یہ گشہ کاڑا ہے۔ دہاں سے بھاگ کر آیا ہے۔“

”میں ہے۔“

اسد نہ شک کر اُس کا منہ دیکھنے لگا۔ یک لمحے کے لیے اُس کا ذہن مکمل طور پر خالی ہو گیا۔ وہ کیا جواب دے سکا اور اُس کو ساری بات بتادے ہے ساری نہیں تو کتنی تباہی؛ اتنی جلدی میں کیسے تباہی؟ ریاض اُس کا اتنا فہم کھینچ رہا تھا۔

و چلو۔ ریاض میتابی سے بولا، دروانے میں نہیں رک سکتے:

اس نے آفری باربے اسیدی سے ادھیرے میں غائب ہوتے ہوئے انہیں آدمیوں پر نظر ڈالی۔ میر حسن اپنے مخصوص انداز میں بازو پر ایک بھرا کر پختے ساتھی ہے کوئی بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے جگ کر ریاض کے پیچے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر کھڑے ایک آدمی نے دروازہ بند کر لیا۔ اس کا دل پھر پھٹرا رہا تھا۔

دین کا گھر دکھر دل پر مشتمل تھا۔ پستہ کرے میں سب جمع تھے۔ یک گونے میں کھاٹ پر سلطان شاہ یک اشخاص کے ساتھ بیٹھا رہا تھا اسماں کر نیچی انداز میں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے اتحادوں کی حرکت اور بات کی روائی تڑپے بنیسر گھری تفروں سے اسد اور ریاض کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں جاکر ایک طرف بیٹھ گئے جہاں پہلے میں آدمی دیوار سے ٹیک لگائے ہیں تھے۔ کرد تباکر کے دھریں سے بھرا تھا۔ کرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سوچ گیا۔ تھا کہ دھواں حکم کشیری تباکر کا دھرانہ تھا۔ اس کا جیسی چند منٹ کے بعد کھلا جب اس شخص نے جس سے سلطان باتیں کر رہا تھا، جیب سے دلایتی سگر ٹوں کی ایک ڈیناں کالی اور ایک سگر بیٹھ خود نکال کر دوسرا سلطان کر دیئیں کیا۔ دونوں نے سحریٹ سلاگئے۔ وہ بارہ بات شروع کرتے کرتے سلطان نے اواز بہت نیچی کر لی۔ کچھ دیر تک اسی خوبی پہنچے میں باتیں کرنے کے بعد اس نے چدوں طرف یک اور نظر دڑائی، پھر دوناں بند کر کے سر کے ایک پلکے سے اشارہ کرے کے ساتھ اپنے مخاطب کو پھٹکے کرے میں پلٹھے کے پیٹے کہا۔ اس شخص نے ایک کافر، جو اس نے کھاٹ پر پھیل دکھا تھا، اسماں کر نہ کیا۔ اور وہ دونوں اتحادگرے ہوتے۔

آنہیں پھٹکے کرے میں گئے چند منٹ ہوتے تھے کہ ریاض کسماں کے قریب سے اٹھا اور پھٹکے کرے کی جانب بڑھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”پیچے۔“

اسہ اس کی سیہ نذری پر حیران رہ گیا۔ ریاض ایک منٹ تک سختی پر نیچی انداز میں دروازے میں اٹھا کھڑا رہا، پھر قدم بٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ جہاں وہ میٹھا تھا وہاں سے پھٹکے کرے کی کوئی شے نظر نہ آ رہی تھی۔ خاموشی اتنی تھی جیسے اس کرے میں کوئی بشر موجود نہ ہو۔ یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں، اس نے پہ خیالی میں سوچا۔ دین کہاں ہے؟ کہیں وکھائی نہیں دیتا۔ اس نے ایک نظر پاس بیٹھے ہوتے تھے میں کوئی پردازی۔ وہ دیکھنے میں عام کشیری مذہرگر رہے تھے جو دیوار کے ساتھ پچھے بیٹھے تھے۔ وہ آدمی جس کی دیلوں دروانے پر تھی اب اگر خل کھاڑ پر بیٹھ گیا تھا۔ خاموشی اتنی تھی کہ پھٹکے کرے میں اس کی تسلی کے جلنے کی اواز آئی۔ پانچوں آدمیوں نے آہر دیکھا۔

تیل کی روشنی لئے بھر کے لیے دروازے میں اُبھری، پھر غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیوار کے ساتھ جمع ہے
ہرئے تینوں آدمیوں نے صرگوشیوں میں باقی شروع کر دیں۔ ان کی آواز اسکے کان میں پڑی اور اُس نے صرورد
کر ان کی جانب دیکھا۔ مگر اُس کی سماں نے دیکھنا اور کافیوں نے سنا بند کر دیا تھا۔ نہت ایک نام تھوڑے کی
طرح اُس کے داخن پر پڑا تھا۔ میرحسن؛ جہاں تک اس پاس کی چیزوں کا تعلق تھا، وہ محقق ان کی حرکات کو
دیکھ بھال رہا تھا، ان کی نوبت سے بے خبر تھا۔ اُس کے اندر کی نظریوں کے سامنے ایک بیٹھکل تھی۔—
اُس شکل کے متعدد رُخ تھے؛ میرحسن کا نازک پڑیں والا پرندہ چہرہ، وحیسے قدیم سنجار کی چمک لیے ہوئے تیر
آنکھیں، اُس کے بدن کی جھٹکے دار حرکات، دُرمی دُرمی، مگر قوی اور پھر تیل۔ جیسے کہ وہ حکیموں کے مطبع میں کھڑے
اور دہشت زدہ پرست کوت آواز میں کہہ رہا ہے، ”میں تو آیا، می ہوں؛“ اور پھر، حرکت کا کوئی اشارہ دیجئے بغیر
وہیں کھڑا کھڑا پاؤں سے اٹھتا ہے اور ایک خیرت انگریز چلانگ کے ساتھ کرے کر پا کر کے تجوہ کی مانند ادھیرے
میں غائب ہر جا تھے، نہ پاؤں کی چاپ چھوڑتا ہے نہ شان! اب یہاں کیسے پہنچ گیا ہے؟ کب سے یہاں
پہنچے؟ اسی وقت سے ہے مجھے اس کا پتا کیوں نہیں چلا ہے؟ واپس گشاد جا کے آیا ہے یا یہیں پڑا ہے؟ رُخ
پہنچتا ہے؛ اب کیسے اعتماد سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دروانے سے میں سے بیکھرا ہے اور ایک طرف کو
چل پڑتا ہے جیسے اُسے پوری خیرت کو کھسکر جانا ہے، مگر اسی چاپ سے، اسی حرکت کے ساتھ، بازو کو
جھٹکے سے ہوا میں اٹھاتا اور گراٹا ہوا، باقیں کرتا ہوا، تجوہ کی طرح پھر اس خیرتے ہیں غائب ہر جا تھے۔ کیا اسے
بھی ذوالغفار نے بھرتی کیا ہو گا یہ ضرور کیا ہو گا۔ پھر ذوالغفار نے کیوں مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے؟ میں اُس کا
نام چھپا تے پھر تاہُر اور کوئی مجھ کو اُس کی خبر ہی نہیں دیتا۔ یہ کیسا انصاف ہے۔

اُس کے ذہن پر ایک مزبب دوسری۔ انصاف؛ یہ کیا چیز ہے؟ یہ قدیم آفت! اشیے کے دلیوں کے
ساتھ ساتھ اب انصاف کے تاریک عفریت نے اُس کے دل میں کروٹ لینی شروع کر دی تھی۔ اسکے اندر ایک
شید کرب کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس عفریت کو سر کرنے کے لیے اُس نے جان کی بازی لگادی تھی۔ اُس
نے ایک لمحے کے لیے سرخی سے دُسپا کر کے سوچا۔— مگر یہ بلا دیہیں کی رہیں موجود تھی۔ کیا اس قدم پر بہرہ پڑے،
ہر جلے پر جان کی بازی لگانا ضروری ہے؟ کیا یہ قدر کبھی ملے نہیں ہوتا؟ یہ کیسا انصاف ہے، اس نے سوال
دل میں دہرا لایا۔ پھر اپنے سوال کی حاصلت پر ملکا اٹھا۔ اُس کے دل میں شید ماڑی کی ایک بہرائی۔ اُس نے سمجھا
تھا کہ اگر وہ خاموشی سے حالات کا شکار بنے رہے کیونکہ اپنے ارادے کا، اپنے عمد کا ایک قدم اٹھا کر حالات
کا نسلکار کرنے کو بخلے تو اُس کا معاملہ ہو جائے گا۔ مگر معاملہ ٹھے کہاں ہوا تھا؟ اُس کی سماں کے ساتھ ملا جو

کے عقب میں خوشی کا بے نقش چہرہ تھا جو اس کے فہم میں نہیں آتا تھا، جو بیرسن کا چہرہ بھی ہو سکتا تھا اما دی جو اس کا رپا چہرہ بھی تھا۔ اتفاق کیا چڑھتے ہے بے کہاں ملتا ہے؟ حقیقت میں یہ چہرہ کسی کا چہرہ ہے جسے وہ دُنونہ نہیں سکتا؛ وقت کا دباؤ، جس کو اس نے پوری قوت سے ایک دھنک دیا تھا، اب پھر اس کو گھیرے میں لے رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹکیک لگائے، اس تنگ ہوتے ہوئے گھیرے میں مجوس بیٹھا تھلا تارہ، اور آج کئی روز کے بعد اس کا سینہ بھاری ہنا شریح ہوا۔ اس کا پتا نکالنا کوئی مشکل بات نہیں، اس نے سوچا، ریاض کو عالم ہے بے کہاں رہتے ہے، اس کے ساتھیوں کو بھی ریاض جانتا ہو گا۔ میں اس نک پہنچ چاؤں گا۔ اس نے جرم اگر کیا نہیں تو اسے علم غرور ہے، ورنہ اس طرف کیوں آتا۔ اے کیا ضرورت تھی؟ سانس کی کادش سے تھک کر اس نے کمر سیدھی کی اور دیوار کے ساتھ اپنچا ہو کر بلیخ گیا۔

میں اس کا سراغ لگا کے رہوں گا، وہ دل میں گر جا۔

اس نے انجھیں انھائیں تو ریاض سانے کھڑا تھا۔ ”چلو“ ریاض نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے باہر نکل گئے۔ قبے سے محل کروہ پہاڑوں کی تاریکی میں داخل ہوئے تو ریاض بولا:

”میں نے کامِ کمال بیا ہے۔“

”کیا کام؟“

”پاہیوں کے ساتھ۔“

”جاری ہے ہو؟“ اس داشتیاں سے بولا۔

”ہاں۔“

”کب؟“

”کمل۔“

”اتنی جلدی کام کیسے بن گیا۔“

”ایک لمحہ میں بک بک کے بعد مانہے شور کا نغم۔“

”ایک لمحہ؟“ اس دیوانہ ہو گیا۔

”اور کیا تم سور ہے سچے؟“

”کیا کہتا تھا ہے؟“

”کہتا تھا غلام ساتھ پھٹے، یا غم۔“